ادا جعفری: ایک رجحان ساز غزل گو

بہ حوالہ تصورِ حیات و ممات

ڈاکٹر صائمہ شمس
لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

ADA JAFERI

A TREND SETTER GHAZEL POETESS

Saima Shams, PhD
Assistant Professor of Urdu,
Lahore College for Women University, Lahore

Abstract

The article depicts the concept and feelings of Ada Jafery about life and death. Ada Jafery was brought up in a feudal society. She succeeded to get herself recognized in conflicting social and political behaviors of her time. She spent her life with an obligation through her art. She accepted the life with its happiness and pains. In the perspective of death the morality of life earns more significations that make life more dynamic than before. The deep thoughts about grief and death appeared in the form of life and hope, and this is the distinctive feature of Ada Jafery's Urdu Ghazal.

Keywords: ادا جعفری، ترقی پسند تحریک، ہندی اردو، وطن، بدایون، گنج شہیداں، نیو انگلینڈ، ایملی ڈکنس

(۱)

۱۹۴۰ءتا ۱۹۵۰ءکی دہائی قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہنگامہ خیز اور پرشور رہی ہے۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ تہذیبی بقا اور تحفظ کے لیےقومی زبان کے انتخاب کا مسئلہ زوروں پر رہا۔ ہندی اردو کی مشترک کانفرنسیں، مفاہمت کی فضا تیار نہ کرسکیں۔تحریک آزادی کا نتیجہ، ہندوستان کی تقسیم کی شکل میں سامنے آیا۔ بین الاقوامی سطح پر آمریت وسامراجی استبداد کے خلاف مظاہرے ہورہے تھے۔ مشرق میں چین، عالمی دنیا کے نقشے پر ابھر رہا تھا۔ ادب میں ترقی پسند تحریک اشتمالیت اور اشتراکیت کا نظام رائج کرنے کے مشن پر تھی۔پانچویں دہائی میں ترمیم وتنسیخ کا عمل شروع ہوا۔ انتہا پسند ادبا وشعرا اور اعتدال پسندوں کے دوفریق بن گئے۔ ذہنی تعیش کا نام دی جانے والی شاعری پر توجہ دی جانے لگی۔ اس ماحول میں زندگی کے بارے میں نظریات کا تنوع اور تضاد سامنے آرہا تھا۔ اداجعفری کو اس فضا میں سے کسی ایک تصورحیات کا انتخاب کرنا تھا۔ابتدا میں تو یہ آسان کام نہ تھا۔

زندگانی تھی کاکلِ برہم
آپ سلجھائی آپ الجھائی (۱)
الجھنیں ہی الجھنیں ہیں زندگی میں ہر نفس
ہر نفس اس زلف کی ژولیدگی بڑھتی گئی (۲)

مگر اداجعفری راہبر کی تلاش میں بھی رہیں جس کی سرکردگی میں زندگی کی مردہ روایتوں سے چھٹکارا پایا جا سکے اور زندگی کو ذات سے الگ کر کے دیکھا جا سکے۔ اداجعفری نے زندگی کے مسائل سے نظریں نہیں چرائیں۔ زندگی کی مثبت قدریں، فن کے توسط سے اجاگر کیں۔کم زوروں کی پامالی کے خلاف احتجاج کو ایک فرض سمجھ کر نبھایا اور مشرق کی صالح روایات کو برقرار رکھا۔زندگی کے اندیشوں کو زیادہ سے زیادہ خوش گوار بنانے کے لیےحسن خیال وحسن عمل کے امتزاج کو کام میں لائیں۔ان کی فکر ہر لحاظ سے حیات افروز ہے۔ اداجعفری نے ایک مقام پر کہا تھا:

''میں نے شاعری کا سفر ایک ہی لفظ آرزو کے سائے سائے طے کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ حرف صداقت جو لکھنے والے پرفرض بھی ہوتا ہے۔ اس پر قرض بھی ہوتا ہے۔ جو دین ہے۔ جو وطن کی محبت ہے۔ جو خود انسان کا اس

روئے زمین پر مرتب ہے۔ اور یہ جو تصویریں ہیں یہ نہ کسی چوپال کی ہیں نہ کسی محل سرا کی۔ یہ دلوں کے اندر کی، ذات کے تہ در تہ حجابوں کی تصویریں ہیں۔ یہ زندگی کے خاکے ہیں۔ کچھ میری ذاتی کچھ ہماری اجتماعی زندگی کے......زندگی کی سچائیوں نے مجھے جو پھولوں اور زخموں کے گجرے دیے ہیں وہی میری متاع ہیں۔ میں جس عہد میں زندہ ہوں یہ اس عہد کے خواب ہیں''۔(۳)

پھولوں اور زخموں کے وہ گجرے جنھیں شاعرہ نے اپنی متاعِ حیات بنایا، اگر اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہیں تو خودنوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کے اوراق میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جس کے مطابق ادا جعفری نے اپنے آپ کو اس معاشرے کی فرد بتایا ہے جس میں سانس لینے سے پہلے ہی عورت زندگی سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو کہیں رکھ کر بھول جانے والی، اپنے رازوں میں دوسروں کو شریک نہ کرنے والی، ٹونک پھاٹک کے اندر، روایات اور رسوم میں اٹے ہوئے ماحول کی پروردہ، جہاں غیر شادی شدہ عورت کی رائے یا حیثیت نہ ہو، جہاں شادی شدہ بھی اپنی زندگی کا اثبات میکے کی روایات اور رواجوں پر قربان کرنے پر مجبور ہو، جہاں زیور، لباس اور آسائش ہی اصل زندگی ہو اور جہاں بقول ادا جعفری ''زمرد کا گلوبند ادراکِ حیات سے زیادہ قیمتی'' ہو، وہاں شاعرہ نے زندگی کی تاریکی کو یادوں کے دیے جلا کر روشن کیا ہے اور شعورِ غم کو غنیمت جان کر فریضۂ حیات نبھانے کی بھرپور سعی کی ہے نیز زندگی کے بدلتے رنگوں کی پیش کش کا فرض بھی ادا کیا ہے۔ مثلاً کہتی ہیں:

زندگی کی رگوں کو لہو بخش کر
اہل دل فرض اپنا ادا کر گئے (۴)

زندگی نکہت گل، رنگ سحر
اور اک سانس، کبھی بارگراں (۵)

ان تمام حالات میں وہ زندگی سے بدظن نہیں۔ انھوں نے زندگی کی تاریکی کو یادوں کے دیے جلا کر روشن کیا ہے۔ ان کے لیے شعورِ غم بھی غنیمت ہے۔ انھیں یہ فکر بھی دامن گیر ہے کہ غموں کی دھوپ بھی کجلا گئی تو کیا ہوگا۔ وہ جمالِ حیات سے بدظن نہیں۔ ان کی زندگی کی معراج طلب اور

آرزو ہے جس کی بدولت ان کا گزر جہاں سے بھی ہوا، ایک راہ گزر ارملتا گیا۔ اسی جہانِ طلب میں آرزو اور سفر ایک دوسرے کے قدم بہ قدم دکھائی دیتے ہیں جو اداجعفری کی آواز اور تصور حیات کو ایک بھرپور توانائی عطا کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

وہ رہ گزر تھی وفا کی کہ زندگی کا سفر درخت کا کہیں سایہ نہ دھوپ کجلائی (۶)

تمام عمر سفر میں گزار دوں اپنی!! تمام عمر تمنائے رہ گزر میں رہوں (۷)

میں دشت زندگی میں کھلے سر نہیں رہی اک حرف آرزو کی ردا مل گئی مجھے (۸)

زندگی کی طرح خراج طلب کوئی درماندہ آرزو ہے ابھی (۹)

اس راہ طلب و جستجو میں ادا کو اگر کہیں مایوسی کا سامنا ہوایا احساس بےزاری نے راہ پائی تو فوراً انھوں نے اپنا قلم ان مجروح و محروم جذبات و احساس کی تعمیر میں استعمال کیا اور تاریک گھروندوں میں عزم و حوصلہ کے دیپ جلائے ہیں۔ بقول محمد عبدالغفار:

> ''کوئی تعمیر بغیر تخریب کے ممکن نہیں۔ لوگ اسے بہت ہی فتنہ انگیز نظریہ قرار دیتے ہیں لیکن ۔۔۔ ہر روز کی زندگی میں یہ نظریہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔۔۔ وہ خود اپنی بیزاری اور یاس کے ہر نقش پر امید، آرزو اور ارادے کی ضرب لگاتی ہیں''۔(۱۰)

اسی لیے وہ جینے کے آزار کے سامنے سینہ سپر ہو کر کہتی ہیں:

کیوں اہل وفا! زحمت بیداو نگاہی جینے کے لیے اور بھی آزار بہت ہیں (۱۱)

جب مرگ آبرو کی عزادار تھی وفا پیغام زندگی لب تشنہ سے آئے ہیں (۱۲)

ایسی بھی ساعتیں تھیں جو نامہرباں نہ تھیں یوں جیسے آندھیوں میں صبا مل گئی مجھے (۱۳)

زندگی کی خوش آیندگی پر شاعرہ کا یہ اعتماد کتابوں سے رغبت کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ وہ اپنی ایک نظم ''اُفق کے پار'' میں بھی ''حیاتِ نو'' کے اشارے سمجھنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ کتابوں سے مسیحائی کا کام لینے والی اداجعفری کا کہنا ہے کہ انھوں نے حرف کی سرگوشیاں سنی ہیں، لفظ کو اپنے بھید بتائے ہیں اور کتابیں زندگی سے ہم سخن ہونے کا وسیلہ بھی بنیں۔ مزید کہتی ہیں:

> ''میں نے کتاب کو انسان کے مقابلے میں حیات سے قریب تر دیکھا تھا۔

جب میں اندھیروں کے جنگل میں کھو گئی تھی اور میں نے جگنوؤں سے اُجالا
چاہا تھا تو یہ میرے رہنما ستارے بن گئی تھیں''۔(۱۴)

معاشرتی جبر اور استحصالی معاشرے میں کتاب بینی نے شاعرہ کے قلب ونظر میں وسعت پیدا کی۔ایک عورت کی حیثیت سے ادا نے احساس کی لطافت کے رنگ بکھیرے ہیں۔ ان کی امیدوں، آرزوؤں اور ارادوں میں لہجے کی پختگی ہے مگر کرختگی نہیں۔ایک جگہ کہتی ہیں:

''عورت ایک ہی مہلت میں حیات کے کئی جیون جھیلتی ہے قلم ہاتھ میں تھام
لے تو یہ جھمیلے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں۔ زندگی بسر کرنے کے آداب کچھ کہتے
ہیں۔اپنے آپ سے ملنے کے راستے کہیں اور نکلتے ہیں''۔(۱۵)

ادا نے ان جھمیلوں کو بطریق احسن نبھایا۔وہ اس طرح کہ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۴ء شادی اور بچوں کی مصروفیات میں اپنے آپ کو مگن رکھا اور ۱۹۶۵ء میں دوبارہ کوچۂ شاعری میں قدم رکھا۔ زندگی کے میلے میں اپنی شرکت کو کسی نہ کسی تعلق سے یقینی بنائے رکھا جس کا اعتراف وہ ترقی پسند ادب کے مطالعہ کے پس منظر کے ساتھ کرتی ہیں۔زندگی کے بارے میں ادا جعفری کا زاویہ نگاہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ انھوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام تجربات وواقعات کا اظہار کھل کر کیا ہے لیکن زندگی اور لہجے کے وقار اور شائستگی پر حرف نہیں آنے دیا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے نمود کی خواہاں ہیں جہاں اعلیٰ اقدارِ حیات کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں۔اس آدرش کے لیے اُن کے لہجے کا اعتماد اور تیقن ان کی اردو غزل میں جابجا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اردو غزل میں زندگی اور حالات کے متنوع ومتضاد پہلوؤں کو جگہ دی مگر کہیں بھی زندگی کی طرف یاسیت یا بے دلی کو غالب نہیں آنے دیا۔

''ادا جعفری کا فن کاروانِ حیات کا تماشائی ہی نہیں ہم سفر بھی ہے اور تنہائیوں
کے تاریک دیس میں اس قدر دُور نکل آنے کے باوجود آگہی کی یہ مشعل ان
کے ہاتھوں میں فروزاں ہے''۔(۱۶)

(۲)

وطن کی آزادی اپنے ساتھ بہت سے خواب لے کر آئی۔ ان خوابوں میں ادا کا بھی حصہ تھا۔

مگر گردوپیش کی سیاسی شوریدگی کے علاوہ ہیروشیما کی تباہی کے آثار بھی سامنے تھے۔ اب صنعتی تہذیب اور سائنسی ایجادات انسانی جسم کے لیے صرف نفع بخش نہیں رہی تھیں بل کہ ہلاکت اور جان کے زیاں کا بھی ایک کھلا ثبوت تھیں۔ ایٹمی ہتھیار کے بل بوتے پر کسی بھی قوم کوموت کی نیند سلایا جا سکتا تھا۔ اس خوف زدگی نے موت کے بارے میں سوچنے کا انداز بدل دیا۔نئی زندگی کے خواب دھندلانے لگے۔ ادا پر ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھارتی حملے کا اثر یہ ہوا:

''سانس کی جس آمد وشد کو انہوں نے دم عیسٰی جانا تھا وہ بارود کی بو ثابت ہوئی۔ وطن کی سوندی مٹی اور اس کی ہریالی نے تقدس وفا اور عفت و ناموس حیات کی خاطر از سر نو انہیں آواز دی''۔(۱۷)

زبان کے نام پر فسادات کی یادگار ''شہید مینار'' کی شکل میں ڈھاکہ میں، زبان کے نام پر پہلی بار لوگوں کا بنگال میں محصور ہونا، پاکستانیوں کی بے گھری کے واقعات، کراچی میں فسادات، لیاقت علی خان کی شہادت۔ یہ تمام موضوعات، ادا جعفری کی تخلیق کاری کا موضوع بنے ہیں۔ زبان کا نام لے کر، ناقابل شکست قوم کا قبیلوں اور علاقوں میں بٹ جانا اور محبت اور یقین سے بے بہرہ ہو جانے کے عمل کو ادا جعفری نے اجتماعی خودکشی کا نام دیا ہے۔ آگ اور خون کی اس ہولی پر انھوں نے اپنی فکر کا اظہار اپنی خودنوشت میں بارہا کیا ہے مثلاً ''شہر کو سیلاب لے گیا'' میں کہتی ہیں کہ ''زبان کبھی اتنی ظالم تو نہیں تھی کہ قومی وقار اور انسان کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہو جائے'' اسی باب میں آگے چل کر ایک نظم ''کیوں'' کے کچھ مصرعے بھی شامل کیے ہیں جس میں خوف، وحشت، افلاس، نفرت آلود فضا اور انسانی آدرش کے دم توڑنے کی سسکیاں سنائی دی جا سکتی ہیں:

تم تو اس عہد کے انساں ہو جسے / وادی مرگ میں جینے کا ہنر آتا تھا
مدتوں پہلے بھی جب رختِ سفر باندھا تھا / ہاتھ جب دستِ دعا تھے اپنے
پاؤں زنجیر کے حلقوں سے کٹے جاتے تھے / لفظ تقصیر تھے
آواز پہ تعزیریں تھیں / تم نے معصوم جسارت کی تھی
اِک تمنا کی عبادت کی تھی / پابرہنہ تھے تمہارے
یہی بوسیدہ قبا تھی تن پر / اور یہی سرخ لہو کے دھبے

جنہیں تحریر گل و لالہ کہا تھا تم نے / ہر نظارہ پئے نظارگی جاں تم کو
ہر گلی کوچہ محبوب نظر آتی تھی / رات کو زلف سے تعبیر کیا تھا تم نے
تم بھلا کیوں رسن و دار تک آ پہنچے ہو؟ / تم نہ منصور، نہ عیسیٰ ٹھہرے (۱۸)

دراصل مذکورہ بالا تمام الم ناک واقعات ادا جعفری کے لیے زندگی کی شکست خوردگی اور موت وشہادت کے استعارات بن گئے اور داخلی یا خارجی سانحہ بنے بغیر نہ رہ سکے۔ غزل کے ایک شعر میں کہتی ہیں:

نفرت کی بات تھی، نہ محبت کی بات تھی
مرنے چلے تھے جس پہ صداقت کی بات تھی (۱۹)

مفاد، جب صداقت کی راہ میں حائل ہو جائے تو صلح وآشتی اور انصاف کی امین قوموں کے معیار بھی بدل جاتے ہیں۔ پاکستانی سیاست بھی چند سالوں کے بعد کرسیوں کی تقسیم تک محدود ہوگئی تھی۔ اہل ہوس نے اس مقصد کے لیے سب کچھ داؤ پر لگانا قبول کر لیا تھا۔ دوسری جانب اسی طبقے کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہونے والا طبقہ بھی تھا۔ اس معاشرتی اونچ نیچ اور افراط وتفریط کا گہرا شعور ادا کی اردو غزل میں موجود ہے۔ لہٰذا موت کے تناظر میں دنیا کی بے حقیقتی کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

سوچ کے تغافل کرو دنیا ہے یہ لوگو!!
چڑھتے ہوئے سورج یہاں پل بھر میں گہے ہیں (۲۰)

مفاد پرستی کا یہ انجام اپنے عہد کے جاگیردارانہ ماحول کی شان وشوکت اور کھوکھلے پن کا عکاس ہے۔ پسے ہوئے انسانی معاشرے کے لیے ایک نوید بھی ہے کہ انجامِ کار موت سب کو یکساں کر کے رکھ دے گی۔ ادا نے یہاں اپنے عہد کے تضاد اور معاشرتی ذہنی رویوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ان میں نفسیات کی رُو سے بچپن کے واقعات بچے کے ذہن پر جو نقوش ثبت کرتے ہیں وہ دیرپا اور زُود اثر ہوتے ہیں۔ تصورِ موت کے حوالے سے ادا کے والد کی وفات کا ذکر اور ان کے ذہن پر اس کے اثرات کا جائزہ بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ کہتی ہیں:

''اب یہ یقین دلانا آسان نہیں تھا کہ ایسے جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔

چنانچہ ایک صبح امی نے ایک فیصلہ کیا وہ مجھے لے کر وہاں گئیں جہاں زندگی پر
موت کی فتح کے آثار اپنی تمام تر آزادیوں کے ساتھ آنکھوں کے آگے موجود
ہوتے ہیں''۔(۲۱)

تین سال کی عمر میں والد کی موت کے صدمے کے بعد اگر چہ ادا کی کھلونوں سے دل چسپی ختم ہوگئی تھی اور پیچھے ایک خاموش، گم سم اور تنہا بچی رہ گئی تھی لیکن اس کے سامنے کاپیوں اور پنسلوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ والد کی جدائی کے غم نے کتابوں سے رفاقت پیدا کر دی تھی۔ مگر ادا نے اس صدمے کو بار بار دہرانے کی بجائے اسے زندگی کی ایک حقیقت سمجھ کر قبول کیا اور شعوری طور پر اس سے سمجھوتہ کر لیا۔ اس طرح ان کے ہاں موت سے مربوط احساس و تصورات کسی خالی پن یا ناکامی کی علامت نہیں بنتے۔ موت کے بارے میں بچپن میں جس تصور نے بنیادی صورت اختیار کر لی تھی، وہی ان کی غزل کا ایک مستقل ذہنی رویہ بن جاتی ہے۔ موت کی قبولیت کا اثر یہ بھی ہوا کہ انھوں نے موت کو ایک اثباتی حوالے سے دیکھنا شروع کر دیا۔ جس کی رُو سے یہ زندگی کو قابلِ قدر بنا دیتی ہے اور زندگی کے بارے میں مثبت رویوں کو جنم دیتی ہے مثلاً:

جتنا جتنا بے ثباتی کا یقیں آتا گیا
اتنی اتنی زندگی میں دل کشی بڑھتی گئی (۲۲)

یہ طرزِ فکر، موت کے جبر کو، زندگی کے اختیار میں بدل دینے کی ایک کاوش ہے۔ زندگی کے وقتی ہونے کا احساس پژمردہ نہیں کرتا بل کہ جس قدر یہ تیقن بڑھتا ہے زندگی کی رعنائی میں اضافے کا احساس اسی قدر بڑھتا چلا جاتا ہے یعنی زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں کی بجائے زندگی سے حاصل کردہ خوشیوں کی قدر و قیمت دوچند ہو جاتی ہے۔ انسانی زندگی کی بے ثباتی کے اس یقین نے شاعرہ کو زندگی کے واقعات سے بے تعلق نہیں کیا بل کہ اسبابِ حیات اور مقصدِ حیات کی بہتر تفہیم عطا کر کے زندگی کو گراں قدر بنا دیا ہے، زندگی کی وقعت کا احساس بڑھا دیا ہے، جاری لمحوں کو اہم بنا دیا ہے۔ اس طرح زندگی کی کارکردگی کی تہہ میں موت اور موت کا یہ تصور زندگی کے لیے جوشِ جذبات کا ماخذ بن جاتا ہے اور حیاتِ بے اعتبار میں موت، یقین کی گواہ بن جاتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ادا کا بدایوں شہر ''گنجِ شہیداں'' اور ''پیراں والا'' کہلایا۔

جہاں کسی نوزائیدہ بچے کا تعارف مزار پر حاضری دینے، چراغ جلانے، نفل پڑھنے، صندوقچی میں رقم ڈالنے اور اس طرح کی دیگر رسومات کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ گویا پیدا ہونے والے بچے کی زندگی کی توثیق ان رسومات کے بغیر ممکن نہ تھی۔ زندگی اور موت کی ثقافتی اور تہذیبی جہت کے دیگر نمونے بھی ادا کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ مثلاً جب شوہر کی ملازمت کے سلسلے میں انھیں دنیا بھر کی سیر کا موقع ملا، وہاں مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں موت اور تصورِ موت کے جو مظاہر دیکھنے کو ملے اُن کا اظہار بھی اپنی نثر میں جا بجا کیا ہے۔ نیو انگلینڈ کی گوشہ نشین ''ایملی ڈکنسن'' کے گھر ایک نظم کے حوالے سے موت کو ایک ''لا متناہی ابدیت'' کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسی طرح انجمن پسند ''سلویا پولاتھ'' کی خودکشی کے حوالے سے دونوں کے رنگ تضاد کا تذکرہ متعدد بار ملتا ہے۔ ''ایک سب آگ، ایک سب پانی'' میں انھی دونوں حوالوں سے ادا نے زندگی اور موت کے بارے میں تصورات اور ان کے اثرات دو جملوں میں واضح کیے ہیں:

> ''سوچتی ہوں کہ زندگی کی ناکامیوں سے کام لینے میں دونوں یک رنگ رہیں
> فرق تھا تو اتنا کہ ایک نے زندگی کو گھونٹ گھونٹ پیا۔ دوسری نے ایک ہی
> سانس میں پیالا خالی کر دیا۔'' (۲۳)

سلویا پولاتھ کے لیے مر جانا ایک فن تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس فن میں غیر معمولی مہارت رکھتی ہے۔ اُس کی خودکشی دراصل مردوں کے نظامِ حیات کے خلاف احتجاج کی حدیں پار کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اس اعتبار سے ادا کے معاشرے اور مغربی سماج میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ امریکہ کی ''آمش'' بستیوں میں زندگی اور موت کے حوالے سے شاعرہ نے عبادت شعاری اور حقیقت پسندی کا ایک منظر دیکھا کہ مکان کے آخری کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک کھلا تابوت نظر آیا جسے ادا جعفری نے ''سفرِ حیات'' کو یاد رکھنے کا بہترین اہتمام اور ''سپردگی'' کے اعتبار سے پسند کیا۔ اس طرح مجموعی طور پر ادا ہی کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے ''جل کی مچھلی'' بن کر ریت پر جینے کا ہنر پیش کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) ادا جعفری، میں ساز ڈھونڈتی رہی مشمولہ موسم موسم (کلیات)، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۶

(۲) ادا جعفری، شہر درد مشمولہ موسم موسم، ص ۲۲۱

(۳) ادا جعفری، چند باتیں (ساز سخن بہانہ ہے) مشمولہ موسم موسم، ص ۴۳۷

(۴) ادا جعفری، شہر درد مشمولہ موسم موسم، ص ۱۷۰ (۵) ایضاً، ص ۱۸۷

(۶) ادا جعفری، غزالاں تم تو واقف ہو مشمولہ موسم موسم، ص ۳۱۴ (۷) ایضاً، ص ۴۲۰

(۸) ادا جعفری، ساز سخن بہانہ ہے مشمولہ موسم موسم، ص ۴۴۷

(۹) ادا جعفری، حرف شناسائی مشمولہ موسم موسم، ص ۵۹۱

(۱۰) محمد عبدالغفار، دیباچہ: مشمولہ میں ساز ڈھونڈتی رہی (مشمولہ موسم موسم)، ص ۲۹

(۱۱) ادا جعفری، غزالاں تم تو واقف ہو، مشمولہ موسم موسم، ص ۳۲۳

(۱۲) ادا جعفری، ساز سخن بہانہ ہے، مشمولہ موسم موسم، ص ۴۴۵ (۱۳) ایضاً، ص ۴۴۷

(۱۴) ادا جعفری، گوشۂ عافیت مشمولہ (خودنوشت) جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۴

(۱۵) ادا جعفری، سلسلے، مشمولہ (خودنوشت)، ص ۱۸۹

(۱۶) فتح محمد ملک، ادا جعفری کی شاعری پر ناقدین کی آرا، مشمولہ ''ادا جعفری: شخصیت اور فن'' از شاہدہ حسن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۷

(۱۷) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ادا جعفری: آج کی شاعری کا ایک معتبر نام مشمولہ اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۵۷

(۱۸) ادا جعفری، شہر کو سیلاب لے گیا، مشمولہ (خودنوشت) جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۲۳۳ + ۲۳۵

(۱۹) ادا جعفری، شہر درد، مشمولہ موسم موسم، ص ۲۳۹ (۲۰) ایضاً، ص ۲۴۲

(۲۱) ادا جعفری، بڑی حویلی مشمولہ جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۱۹

(۲۲) ادا جعفری، شہر درد مشمولہ موسم موسم، ص ۲۲۱

(۲۳) ادا جعفری، ایک سب آگ ایک سب پانی، مشمولہ جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۱۶۰